AFKĀR *Research Journal of Islamic Studies*
Volume 3, Issue 2, December 2019, PP: 77-98
E-ISSN2616-8588;P-ISSN2616-9223
www.afkar.com.pk; www.iri.aiou.edu.pk

Scan for download

بیسویں صدی میں جدید علوم کی اسلامی تشکیل میں ممتاز شخصیات کی خدمات

The Role of the Prominent Intellectuals in Islamization of Modern Sciences in 20th Century

Sarfraz Hussain Saeed
Doctoral Candidate
University of Gujrat, Gujrat

ABSTRACT

There has been a lot of debate and discussion on the issue of Islamization of modern sciences among the muslim intellectuals. The traditional Muslim scholars contend that hence all knowledge is from Allah, so there is no need to re-islamize it. The list of those who did their best in this issue of Islamization of modern sciences is not very long because the Muslims have not taken this issue as serious as it has been or it is. However, some prominent intellectuals worked seriously to conceptualize this problem of the Muslim Ummah and the issue of Islamization of modern sciences as an epistemological and socio-political solution. Secularism and the great speed with which secularization has engulfed the Muslim world, has stirred the Muslim intellectuals from their indifferences and motivated them to act. Despite the massive discussion and literature, Muslim scholars and intellectuals have not struck a common chord among themselves. This article aims to highlight some of those foremost Muslim intellectuals who rendered their services in forming a possible policy with respect to the various interpretations of the concept of Islamization of knowledge, philosophical framework, and who gave a methodology for achieving the goals of Islamization. This paper not only gives introduction of these intellectuals but also explores the possibility of reconciliation between their ideas in the hope of further advancing the cause of Islamization of modern sciences.

Keywords: *Education, Islamization, Modern Science.*

موضوعِ تحقیق کا تعارف، اہمیت اور پس منظر

بیسویں صدی افکار کی صدی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم مغربی استعمار کے غلبہ کے زیرِاثر تبدیل ہوا ہے۔ہمارے تعلیمی اداروں میں تعلیم اسلامی نوعیت کی نہیں رہی بلکہ ہمارے تعلیمی ادارے مغرب زدہ ہونے کی وجہ سے مغربی تعلیمی اصولوں کا پرچار کرتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں مغربی اصولِ تعلیم رائج ہیں۔ہم عصری سائنسی اور سماجی علوم کو اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کر پائے، جس کی وجہ سے ہمارے مدرسے کا طالب علم جدید علوم سے بالکل بے بہرہ نظر آتا ہے اور جدید تعلیمی اداروں کا طالب علم مذہب سے بیگانہ ہو گیا ہے۔آج کے نوجوان کے ذہن میں دین کے حوالہ سے طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے ہیں ، ان لوگوں کے ان اشکالات کو دور کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کو اس کی صحیح روح کے ساتھ پیش کیا جائے۔اس کے علاوہ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ عصری سائنسی اور سماجی علوم کو اسلام سے ہم آہنگ کیا جائے اور ان علوم کو اسلام کاری (Islamization) کی جائے، تاکہ ہمارے نوجوان نہ صرف جدید علوم سے مزین ہوں بلکہ نیک صفت مسلمان بھی ہوں اور دین کے حوالہ جو اشکالات ان کے اذہان میں ہیں، ان کو بھی دور کیا جا سکے۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم مغربیت کے غلبہ کے زیرِاثر کافی حد تک تبدیل ہوا ہے۔ہمارے تعلیمی اداروں میں تعلیم اسلامی نوعیت کی نہیں رہی بلکہ ہمارے تعلیمی ادارے مغرب زدہ ہونے کی وجہ سے مغربی تعلیمی اصولوں کا پرچار کرتے ہیں۔ہمارے تعلیمی اداروں میں اسلامی تعلیمی اصولوں کی بجائے مغربی اصولِ تعلیم رائج ہیں۔بیسویں صدی کے مسلم مفکرین نے سوشل سائنسز اور نیچرل سائنسز جیسے جدید علوم کو اسلامیانے کے سلسلہ میں جو فکر پیش کی ہے، یہ فکر اور ان شخصیات کے افکار بہت گہرے ہیں۔ان افکار کا تجزیہ کرنے کے بعد موجودہ دور میں پاکستان کے نظامِ تعلیم اور تعلیمی پالیسی کے لیے خدوخال وضع کرنا، موجودہ دور کی اشد ضرورت ہے۔

جدید عُلوم کی اسلامی تشکیل میں ممتاز شخصیات کی خدمات

تعلیم کا سیکولر نظریہ یہ ہے کہ مذہب اور تعلیم کا کوئی تعلق نہیں۔تعلیم اور مذہب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔اور یہ نظریہ ہمارے تعلیمی نظام میں بھی سرایت کر چکا ہے کیونکہ ہمارے تعلیمی نظام پر مغربی اثر زیادہ ہو چکا ہے۔

جدید دنیا سائنس کی دنیا ہے۔ سکولوں میں مغربی نظریات دی جانے والی تعلیم کی اساس ہیں۔مسلم مفکرین نے سائنس اور سائنسی نظریات کے متعلق کیا لکھا ہے؟ اس سلسلے میں اُن کی رائے کیا ہے؟ جدید نیچرل سائنس کی تھیوری کیا ہے؟ مسلم مفکرین کی آراء کیا ہیں؟ جدید سائنسی علوم کے اخذ و استفادہ کہاں تک کیا ہے؟ جدید مغربی عُلوم، خاص طور پر سائنسی عُلوم کے متعلق مسلم مفکرین نے جو اخذ و استفادہ کیا ہے، اس کی حیثیت اور نوعیت کی ہے؟ اور اِن سائنسی علوم کی اسلام کاری میں مسلم مفکرینِ تعلیم کی کیا فکر ہے اور انہوں نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ اس کے علاوہ سائنسی علوم کو اسلامائز کرنے میں بیسویں صدی کے جدید ماہرینِ تعلیم کی کیا رائے ہے؟ سماجی علوم کی تقسیم میں اضافہ ہوا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں رُوح ہے جب کہ مغرب کے ہاں نفس ہے۔ جدید سماجی علوم کے بارے میں مغربی نظریات کی اساس کیا ہے؟ سماجی عُلوم کے متعلق مسلم مفکرین کے ہاں کیا رائے ہے؟ جدید سوشل سائنسز کی تدریس کے متعلق مسلم مفکرین کا نظریہ کیا ہے؟ جدید سماجی علوم کی اسلام کاری (Islaminization) میں مسلم مفکرینِ تعلیم کی فکر اور اُن کا کردار کیا ہے؟ نیز جدید سماجی علوم کی اسلام کاری کے حوالے سے بیسویں صدی کے جدید مسلم مفکرین کی آراء اور نظریات کیا ہیں؟ دین کے حوالہ سے جو شکوک و شبہات اور اشکالات ہمارے

نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے اور اس سلسلہ میں کیا حکمتِ عملی اختیار کی جاسکتی ہے ؟
ایک زمانے میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم قرآنی بنیادوں پر قائم تھا، نتیجہ میں ایسے ماہرین پیدا ہوئے کہ جنھوں نے اپنے قابل تعریف کارناموں سے دنیا کی رہنمائی کی۔ بعد کے ادوار میں مسلمان دین سے رشتہ منقطع کر کے غیروں کے افکار و نظریات سے متأثر ہوئے اور ان کے تہذیبی سانچے میں ڈھل گئے۔ مسلمانوں نے ادب، فلسفہ، تاریخ، علومِ عمرانیہ، فنونِ لطیفہ، قانون اور معیشت میں غیروں کی پیروی شروع کردی۔ ان کی فکر و تحقیق کو قبول کیا۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی نئی نسل احساسِ کمتری کا شکار ہوگئی۔ ان حالات میں کئی مسلمان مفکرینِ تعلیم اُٹھے اور مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید ابوالحسن ندوی، ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی، پروفیسر ڈاکٹر سید محمد سلیم، سید نقیب العطاس، سید حسین نصر اور ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ان مفکرین کے حالاتِ زندگی، تعلیمی وفکری نظریات اور خدمات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ان مفکرین نے انتہائی مشکل حالات میں نہ صرف مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کا بیڑا اٹھایا بلکہ تعلیم کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لیے بھی اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کیا۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

بیسویں صدی میں تاریخ کو جن علماء، مفکرین اور قائدین نے ایک نئی راہ فراہم کی ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام بھی شامل ہے۔ مولانا مودودی بیسویں صدی کے ایک عظیم اسلامی مفکر تھے۔ انہوں نے نہ صرف مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت کو ختم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا، بلکہ مغربی دانش وروں کے اعتراضات کی تردید کی اور عقلی و منطقی دلائل سے ان کا زبردست مقابلہ کیا۔ وہ ان چند اسلامی مفکرین میں سے ہیں جنہوں نے برطانوی استعمار کے مذموم مقاصد اور مغربی فکر وفلسفہ کا نہ صرف صحیح طور پر ادراک کیا بلکہ اس کے تدارک کے لیے فکری جہاد بھی کیا۔ ان کی فکر ابتداء ہی سے دفاعی نہیں، بلکہ اقدامی نوعیت کی تھی اور ان کے افکار میں مرعوبیت اور معذرت پسندانہ لہجہ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ماضی میں امام غزالی، علامہ ابنِ تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کی طرح وقت کے سوالات کا اسلام کی روشنی میں جواب دیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے فکرِ اسلامی کی تشریح و توضیح کی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی 25 ستمبر 1903ء کو اورنگ آباد (موجودہ حیدر آباد دکن) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد میں ایک مشہور بزرگ خواجہ قطب الدین مودود چشتی گزرے تھے جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے شیخ الشیوخ تھے۔ سید مودودی کا خاندان انہی خواجہ مودود چشتی کے نام سے منسوب ہو کر ہی مودودی کہلاتا ہے۔ مولانا مودودی کا گھرانہ ایک مکمل مذہبی گھرانہ تھا۔ آپ نے ابتدائی دور کے پورے گیارہ برس اپنے والد کی نگرانی میں رہے اور گھر پر تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انہیں مدرسہ فرقانیہ اورنگ آباد کی آٹھویں جماعت میں براہِ راست داخل کیا گیا۔

1914ء میں دارالعلوم حیدر آباد میں داخلہ لے لیا۔ جہاں انہوں نے مولوی کا امتحان دیا اور کامیاب قرار پائے۔ اس وقت ان کے والدین اورنگ آباد سے حیدر آباد منتقل ہوگئے تھے، جہاں سید مودودی کو مولوی عالم کی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ اس زمانے میں دارالعلوم حیدر آباد کے صدر مولانا حمید الدین فراہی تھے جو مولانا امین احسن اصلاحی کے بھی استاد تھے۔ 1915ء میں مولانا کے والدِ محترم پر فالج کا حملہ ہوا اور والد کے انتقال کے باعث وہ دارالعلوم میں صرف چھ ماہ ہی تعلیم حاصل کر سکے اور آپ کی تعلیم ادھوری

رہ گئی۔ آپ نے22ستمبر1979ء کووفات پائی۔[1]

علمی و تصنیفی سرمایہ

آپ نے پہلے شعبہ صحافت کو بطور پیشہ اپنایااور رسالہ ''مدینہ'' کی ادارت میں شامل ہوگئے۔ اس کے علاوہ رسالہ ''تاج'' اور روزنامہ ''مسلم'' کے مدیر رہے۔ 1932ء میں رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں سلسلہ وار مضامین کا سلسلہ شروع کیااور اس کے بعد یہ رسالہ خود ہی خرید لیا۔آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے بھی زیادہ ہے، جن میں تفہیم القرآن، خلافت وملوکیت اور رسائل ومسائل وغیرہ شامل ہیں۔ تعلیم کے عنوان پر آپ کی دو کتب ''تعلیمات'' اور ''تصریحات'' (انٹر یوز کا مجموعہ۔۔۔ مرتبہ: پروفیسر سلیم منصور خالد) بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔آپ کے فلسفہ تعلیم کی بنیاد توحید، رسالت اور آخرت پر ہے اور یہی تین چیزیں اسلام کی بنیاد ہیں جن سے اسلامی تہذیب کی بقااور نمو کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔آپ کا فلسفہ تعلیم وتربیت اسلام کے بنیادی عقائد سے متأثر ہے۔ یہ فلسفہ تعلیم وتربیت اسلامی تہذیب کے فروغ کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

مولانامودودی نے متعدد تصانیف تحریر کیں جن میں تفہیم القرآن (چھ جلدیں)، تفہیمات (پانچ جلدیں)، رسائل ومسائل (پانچ جلدیں)، الجہاد فی الاسلام، اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی، سنت کی آئینی حیثیت، اسلام کا سیاسی نظریہ اور تجدید واحیائے دین شامل ہیں۔

معاصر افکار ونظریات کے مطابق اسلام کی تشریح

مولانامودودی نے علمی وفکری، سیاسی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی، قانونی اور سماجی دائروں میں نہایت وسیع اثرات مرتب کیے۔انہوں نے اسلام کو ہر دور کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ثابت کیااور دکھایا کہ کس طرح اسلام پر عمل پیرا ہو کر دین ودنیا کی فلاح حاصل کی جاسکتی ہے۔انہوں نے مدلل انداز میں بتایا کہ اسلام ایک ایسی نظریاتی قوت ہے جو دنیا کی قیادت وسیادت اور رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اسلام کو جامع نظامِ حیات اور اعلیٰ اقدار کے حامل فکر وفلسفہ کے طور پر پیش کیا۔انہوں نے ان لوگوں پر تنقید کی جو اسلامی ریاست اور اس کے قیام کو محض خیالی پلاؤ قرار دیتے تھے انہوں نے اپنی تحریروں میں اسلام کو زندۂ جاوید مذہب قرار دیااور بتایا کہ دورِ جدید کے نت نئے نظریات اور مسائل کو اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔

مولانامودودی کا فکری کردار

مولانامودودی بیسویں صدی کے ایک عظیم اسلامی مفکر، مفسر، متکلم، قاءد اور مجدد تھے۔آپ نے دین کے احیاء کے لیے امّت میں ایک نئی روح پھونکی۔ مولانامودودی نے فکرِ اسلامی کو عمدہ، مدلل اسلوب میں پیش کیااور مغربی فکر ورعونت سے مرعوبیت کو ختم کرنے میں اپنااہم کردار ادا کیا۔ مغربی دانشوروں کے اعتراضات کی تردید کی اور عقلی ومنطقی دلائل سے ان اعتراضات کا زبردست مقابلہ کیا۔ مولانامودودی ان چند اسلامی دانشوروں میں سے ہیں جنھوں نے برطانوی استعمار کے مذموم مقاصد اور مغربی فکر وفلسفہ کا درست طور پر ادراک کیااور اس کے تدارک کے لیے فکری جہاد بھی کیا۔ان کی فکر دفاعی نہیں بلکہ اقدامی نوعیت کی تھی۔ان کے افکار میں مرعوبیت اور معذرت پسندانہ لہجہ کا شائبہ بھی نہ تھا۔

مولانامودودی نے اسلام کواس طرح سے پیش کیاجس طرح ماضی میں امام غزالی ، ابنِ تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسے علماء نے پیش کیا۔ مولانامودودی کو اگر انہی نابغہ روزگار ہستیوں کی صف میں شامل کر لیاجائے تومبالغہ نہ ہوگا۔ مولانامودودی نے اسلام کا جامع، مکمل اور واضح

تصور پیش کیا اور اپنی شاہ کار تصانیف اور تحریروں کے ذریعے اسلامی فکر کے مختلف گوشوں پر کام کیا۔ جدید افکار و نظریات کا علمی اور تحقیقی انداز میں جائزہ لیا۔ آپ نے مغربی فکر و تہذیب کا طلسم توڑا اور ان دانشوروں کی تردید کی جو اسلام کو اور اسلامی تہذیب کو ماضی کا قصۂ پارینہ تصور کرتے تھے۔ مولانا مودودی نے اسلام کو مدلل انداز میں دنیائے انسانیت کے لیے متبادل قرار دیا اور اسلام کو زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے قابلِ عمل ٹھہرایا۔ آپ نے قرآن و حدیث کی مرکزیت اور اجتہاد کی اہمیت بیان کی، نیز مسلمانوں میں فکرِ اسلامی کے احیاء کی تحریک پیدا کی۔ آج مولانا مودودی اپنی اسی دانش اور مؤثر نظریہ کی بدولت اہلِ فکر و دانش کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو نادر محاسن و اوصاف اور بوقلموں صلاحیتوں سے خوب نوازا اور متصف کیا ہے۔ انہی میں سے امتِ مسلمہ کی عظیم المرتبہ دینی، اور علمی نابغہ روزگار ایسی شخصیت ہو گزری ہے جس کی صلاحیتوں اور گوناگوں محاسن کا اعتراف پوری دنیائے اسلام میں موجود ہے اور جس کی عظمت و شہرت کا دائرہ علاقائی حدود و قیود سے نکل کر کرۂ ارض کی وسعتوں پر محیط رہا ہے۔ وہ عالمِ اسلام کی مقبول و محترم ایک عبقری شخصیت علامہ سید ابوالحسن ندوی کی ذاتِ گرامی تھی جو مطلع علم و دانش پر پون صدی سے زائد عرصہ تک ماہِ تاباں کی مانند لوگوں کے ظلمت کدۂ فکر و نظر کو منور کر کے بیسویں صدی کے آخری روز 31 دسمبر 1999ء کو غروب ہو گیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں جب برصغیر پاک و ہند پر فرنگی سامراج کے تسلط کا تاریک سایہ ہمہ گیر ہو گیا تو شاہ ولی اللہ کی صورت میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور امّتِ مسلمہ کی فکری و عملی بیداری کا آفتاب آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا تھا۔ پھر اس علمی خاندان میں اور انہی نفوسِ قدسیہ میں سے تحریک مجاہدین بالاکوٹ کے بانی حضرت سید احمد بریلوی نے امتِ مسلمہ میں جہاد و جانفشانی کا جذبہ اجاگر کر کے اسے تازہ ولولہ دیا اور بیداری کی لہر دوڑا دی۔ اسی خانوادۂ علم و فضل کا ایک روشن ستارہ علامہ سید ابوالحسن ندوی کی ذاتِ گرامی تھی جو 6 محرم الحرام 1333ھ کو رائے بریلی لکھنؤ میں مولانا سید عبدالحیٰ لکھنوی کے ہاں پیدا ہوئے، یہ خاندان نہ صرف تحریکِ مجاہدین کا مرکز و محور تھا بلکہ برصغیر کی جملہ تحریکوں کا بھی منبع شمار ہوتا تھا۔

علامہ سید ابوالحسن ندوی 1948ء میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور 1949ء میں سید سلیمان ندوی کی تحریک پر نائب معتمد، 1954ء میں سید سلیمان ندوی کی وفات کے بعد معتمد تعلیمات اور 1961ء میں ڈاکٹر عبدالعلی کی وفات کے بعد ندوہ کے ناظم بنائے گئے۔ 1947ء میں آپ نے ایک پندرہ روزہ اخبار "تعمیر" مولانا عبدالسلام ندوی کے ساتھ مل کر شروع کیا۔ 1951ء میں انسانیت اور خلق کے چلن کو درست کرنے کے لیے آپ نے تحریکِ پیامِ انسانیت شروع کی۔ 1956ء میں مجلس تحقیقات و نشریات شروع کی اور 1960ء میں ایک دینی تعلیمی کونسل قائم کی۔ 1962ء میں حکومتِ سعودیہ نے آپ کو جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کے قیام کے موقع پر آپ کو اس کی مجلسِ شوریٰ کا رکن بنایا، نیز رابطہ عالمِ اسلامی کے قیام کے موقع پر آپ کو اس کی مجلسِ تاسیس کا رکن بنایا گیا۔ عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مفید مشورے بھی دیتے رہے۔ آپ نے جدید تعلیم کی تشکیل و تدوین اور اسے اسلامی نظریات و تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ نہ صرف عالمِ اسلام بلکہ پوری دنیا سے باخبر رہتے تھے۔ امّتِ مسلمہ کو درپیش مسائل پر آپ کی گہری نظر تھی۔ آپ نے دردِ دل اور خلوص سے امّتِ مسلمہ کی فکری رہنمائی فرمائی۔

علمی خدمات

علامہ سید ابوالحسن ندوی علمی خدمات کادائرہ اتناوسیع ہے کہ اس کااحاطہ کرنے کے لیے طویل وقت اور وسیع قرطاس کی ضرورت ہے۔علامہ سید ابوالحسن ندوی امّتِ مسلمہ کے لیےاپنی عربی اور اردوتصنیفات وتحقیقات کا عریض وعمیق، متنوع اور قیمتی ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔آپ کے قلم سے اردواور عربی دونوں زبانوں میں یکساں سلاست وسہولت سے ایساادبی اسلوب پیداہواہے جس کی خوشبو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ذیل میں علامہ سید ابوالحسن ندوی کی ان معروف تالیفات وتصنیفات کاتعارف پیش کیاجاتاہے جواردو یاعربی زبان میں ہیں لیکن ان کاترجمہ عربی،اردواور انگریزی میں ہواہےاوراب کتابی شکل میں شائع ہوچکی ہیں۔

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ،ابوجہل کی نوحہ گری،اپنے گھر سے بیت اللہ تک،اسلام ایک تغیر پذیر دنیامیں،اسلام میں عورت کادرجہ اوراس کے حقوق وفرائض،اسلامی بیداری کی لہرپرایک نظر،اقبال اور عصری تعلیم،اُمّتِ مسلمہ کامستقبل خلیجی جنگ کے بعد،انسانی علوم کے میدان میں اسلام کاانقلابی وتعمیری کردار،تاریخ دعوت وعزیمت،اور مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش آپ کی اردو کتب شامل ہیں۔

اذاهبت ايح الايمان، العرب والاسلام، السيرةالنبوية۔ آپ کی عربی زبان میں تصانیف ہیں۔

علامہ سید ابوالحسن ندوی امتِ مسلمہ کے لیے عربی اور اردوزبان میں اسلامی تصنیفات وتحقیقات کاعریض وعمیق اور متنوع ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ذیل میں مولاناکی چندانگریزی کتب کی فہرست پیش کی جارہی ہے جوانگریزی زبان میں منتقل ہوچکی ہیں:

A Guidebook for Muslims, Appreciation and Interpretation of Religion in the Modern Age, Faith versus Materialism, From Depth of heart in America, Glory of Iqbal, Islam and Civilization, Islam and the World, Islamic Concept of Prophethood, Muhammad Rasoolullah, Musilms in India, Saviours of Islamic Spirit (Complete in four volumes).

اسماعیل راجی الفاروقی

اسماعیل راجی الفاروقی یکم جنوری 1921ء کو برطانوی انتداب کے ماتحت فلسطین کے شہر یافہ میں پیداہوئے۔ابتدائی تعلیم روایتی مسجد مکتب میں حاصل کرنے کے بعد فلسطین میں قائم فرانسیسی کیتھولک سکول میں داخل ہوئے، جس سے فراغت کے بعدامریکی یونیورسٹی بیروت میں پانچ سال تک زیرِ تعلیم رہےاور 1945اءمیں بی اے کی ڈگری حاصل کی انہوں نے انڈیانایونیورسٹی سے 1949ءمیں اوراس کے دوسال بعد 1951ء میں ہارورڈیونیورسٹی سے ایم اے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔1952ء میں انڈیانایونیورسٹی سے جدید مغربی فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے بعد قاہرہ چلے آئےاور چار سال تک(1954ءتا1958ء)جامعہ اَزہر میں علومِ اسلامیہ کی تحصیل میں مشغول رہے۔

جامعۂ اَزہر سے فراغت کے بعد کینیڈاکارُخ کیااور میکگل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (ادارۂ علومِ اسلامیہ) میں1959ء سے 1961ءتک استاذِ زائراور کلیۂ الٰہیات میں ریسرچ فیلومقرر ہوئے۔اب مسیحی اخلاقیات ان کی تحقیق کی جولان گاہ ٹھہرا۔پاکستان میں جنرل ایوب خان کی حکومت نے1960ء میں مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی قائم کیاتواس ادارہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی دعوت پر الفاروقی پاکستان چلے آئےاور2اکتوبر 1961ءسے اس ادارہ سے منسلک ہوئے۔آپ تقریباًدوسال تک بطورپروفیسر اس ادارہ سے منسلک رہے۔

تاہم ادارے کی کارکردگی اور بالخصوص تحقیقی منصبوں سے بددِل ہو کر امریکہ چلے گئے اور 5 اگست 1963ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ ستمبر 1963ء میں شکاگو یونیورسٹی کے کلیہ الٰہیات سے تاریخ ادیان کے استاذِ زائر کے طور پر وابستہ ہوئے۔ 1964ء میں وہ سائراکیوس یونیورسٹی کے شعبہ ادیان میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی کل وقتی اسامی پر مقرر ہوئے۔ انجام کار 1968ء میں وہ ٹمپل یونیورسٹی کے شعبہ ادیان میں علومِ اسلامیہ اور تاریخ ادیان کے پروفیسر مقرر ہو کر فلاڈلفیا چلے گئے، اور اس عہدے پر ۲۷ مئی 1986ء کو اپنی شہادت تک فائز رہے۔[2]

امریکی جامعات سے انسلاک کے دوران فلسفہ، مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ اور علومِ اسلامیہ کی تشکیل و تعلیم، ان کی زندگی کا مقصد اور ان کی مہارت کے شعبے بن گئے۔ انہوں نے مکالمہ بین المذاہب، خصوصی طور پر مسلم مسیحی مکالمہ کے سلسلہ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ زندگی کے آخری دو عشروں کے دوران انہوں نے علوم اسلامیہ کے ایک متجر استاذ، ایک منفرد داعی اور اسلام کے ایک سچے سفیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اسلامک کونسل آف یورپ، لندن کے زیر اہتمام اسلامی دعوت کی اساس اور حرکیات پر کانفرنسوں پر کانفرنسوں اور سیمی ناروں کی منصوبہ بندی اور ان کی تنظیم میں اہم کردار ادا کیا۔ اور اسی سلسلے کے توسیعی منصوبۂ عمل کے تحت اسلام اور مسئلہ فلسطین کی وضاحت کے باب میں گرانقدر حصہ ڈالا۔[3] الفاروقی نے 23 سے زیادہ امریکی و یوروپی، افریقی و جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیائی نیز مشرقِ وسطیٰ وغیرہ ممالک کی جامعات میں استاذِ زائر کے طور پر بڑی وقیع خدمات انجام دیں۔ مزید برآں 6 سے زائد تحقیقی مجلات کی مجلس ادارت کے ایک فعال رکن بھی رہے۔

علمی و تصنیفی سرمایہ

اسماعیل راجی الفاروقی نے امریکا میں اپنی زندگی کے تیئس سال نہایت متحرک و فعال محقق اور مربی واستاذ کے طور پر گزارے۔ اس دوران انہوں نے مختلف و متنوع موضوعات پر 25 کُتب تالیف، تدوین اور ترجمہ کیں۔ ایک سو سے زائد تحقیقی مقالات لکھے اور شائع کیے۔ ان کے تراجم میں محمد بن عبدلوہاب کے کتاب التوحید کے علاوہ محمد حسین ہیکل کی حیاۃ محمد کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے۔ الفاروقی کی تصانیف وتالیفات میں سے ان کا ممتاز اور ہمیشہ قائم رہنے والا کارنامہ ان کی تین کتابیں ہیں، جن میں التوحید، نظریہ اور زندگی کے لیے اس کے مضمرات (ہرنڈن، ورجینیا 1982ء) کلچرل اٹلس آف اسلام (لوئس لمیا الفاروقی کے اشتراک سے؛ نیویارک 1986ء) اور اسلام اینڈ پرابلم آف اسرائیل (لندن 1980ء) شامل ہیں۔[4]

ڈاکٹر راجی الفاروقی کا تبحر علمی مثالی تھا۔ آپ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کر دیا۔ اسلامائزیشن آف نالج کے علاوہ انہوں نے دیگر موضوعات پر بھی لکھا، جن میں مکالمہ بین المذاہب، تہذیبی تصادم، اسلامیات، تعلیم، سائنس اور تاریخ قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر راجی الفاروقی نے 25 کتب اور 100 سے زائد علمی و تحقیقی نوعیت کے مقالات لکھے۔ ان کی چند مشہور تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

On Arabism, Historical Atlas of the Religious of the World, Islamic Thought and Culture, Islamization of Knowledge, Tauheed: Its Implications on Thought and life, Islam and Our Faithsm, Islam and the Problem of Israeel and Christian Ethics.

فکری تشکیل

ڈاکٹر راجی الفاروقی عالمِ اسلام کی ابتر صورتِ حال، اس پر مغربی فکر و تہذیب کے غلبے، تعلیمی صورتِ حال، سیاسی افراتفری اور فلسطین کی آزادی

جیسے اہم امور و مسائل پر نہ صرف غور وخوض کرتے رہتے بلکہ ان کا معقول حل بھی پیش کرنے کی کوششیں کیں۔ زندگی بھر وہ محو جدوجہد رہے۔ تعلیمی میدان میں انہوں اہم کردار ادا کیا۔ وہ تعلیم کو ملتِ اسلامیہ کا یک اہم مسئلہ قرار دیتے تھے۔ آپ نے ایک عملی خاکہ تعلیم کی اسلامائزیشن کی صورت میں دیا۔ ڈاکٹر راجی الفاروقی کہتے ہیں کہ تعلیم کا ایسا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد قرآن وسنت اور توحید پر ہو۔ ڈاکٹر راجی الفاروقی ایک فکر ساز شخصیت تھے۔ آپ نے مغربی دنیا میں فکرِ اسلامی کو متعارف کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

"A scholar, a teacher, a tought bearer, a man with a vision and mission. I regarded him as one of the architects of contemporary muslim resurgence particularly in America and West" [5]

"میرے نزدیک وہ ایک سکالر، استاد، فکری رہ نما اور ایک نظریاتی شخصیت اور مشن کے علمبر دار ہیں۔ وہ عصرِ حاضر میں امریکہ اور مغرب میں مسلمانوں کے احیاء کی عملی جدوجہد کرنے والوں میں ایک عبقری شخصیت ہیں"

لوگ ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی کو مکالمہ بین المذاہب کے حوالے سے جانتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں عوام الناس میں مشہور تھے اور ایک استاذ کی حیثیت سے بھی ان کو مقبولیت حاصل تھی۔ مشرق و مغرب میں اسلامائزیشن آف نالج کے علمبر دار کے طور پر ان کو تسلیم کیا گیا۔

اسماعیل راجی الفاروقی امّتِ مسلمہ میں فکری تبدیل کے خواہاں تھے اور اس تبدیلی کے لیے انہوں نے ایک مؤثر لائحہ عمل دعوت، تعلیم اور علوم کی تشکیلِ جدید کے طور پر متعارف کروایا تھا۔ آپ کے نزدیک امّتِ مسلمہ میں اگر تبدیلی آسکتی ہے تو اسی لائحہ عمل کے ذریعے آئے گی۔ اسی لیے اسماعیل راجی الفاروقی تمام چیلنجز کو تعلیم کے راستے سے نمٹانے پر زور دیتے تھے اور اس کے لیے زندگی کے آخری لمحہ تک سر گرمِ عمل رہے۔ اسماعیل راجی الفاروقی نے مغرب کی متعدد جامعات میں اسلامیات کو بطور مضمون متعارف کروایا۔ وہ کئی تنظیموں اور اداروں کے بانی اور روحِ رواں تھے، جن میں انٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، مسلم سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن اور ایسوسی ایشن آف سوشل سائنسز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی امریکن اسلامک ٹرسٹ کے چیئر مین بھی رہے اور اس کے علاوہ کئی اسلامی تحاریک سے ان کی فکری وابستگی رہی۔

اسماعیل راجی الفاروقی کی ذہنی وفکری تشکیل میں مختلف ومتنوع عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ وہ ایک طرف شیخ محمد بن عبدالوہاب (1703ء-1792ء) سے گہرے طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے تجدیدی اصلاحی تحریک کا بیڑا اٹھایا تو عقیدۂ توحید کو اس کی بنیاد بنایا۔ انہوں نے اس غرض سے عقیدۂ توحید کی ایسی تعبیر وتشریح کی جو شرک وبدعات اور اوہام وخرافات کے قلع قمع کے لیے ایک مؤثر حربہ ثابت ہو سکتی تھی۔ الفاروقی نے نہ صرف یہ کہ مسئلۂ توحید پر محمد بن عبدالوہاب کے تین رسائل کا انگریزی ترجمہ کیا، بلکہ ان تتبع میں امّتِ مسلمہ کے احیاء کے لیے جو لائحہ عمل تشکیل دیا اس کی اساس عقیدۂ توحید پر ہی رکھی گئی۔ اسماعیل راجی الفاروقی کی یہ تعبیرِ توحید بڑی جامعیت کی حامل ہے، جو خدا تعالی کی واحدانیت کی مرکزیت کے بارے میں کلاسیکی افکار اور اسلام کی جدید تعبیر (اجتہاد) نیز اسلام کے جدید زندگی پر عملی اطلاق وانطباق دونوں کے لیے ہے۔[6]

اسماعیل راجی الفاروقی الاخوان المسلمون کے بانی حسن البنا (1906ء-1949ء) سے بھی متاثر نظر آتے ہیں ان کے جذبہ اسلامیت کی پرورش

پرورش و پرداخت میں حسن البنا کے افکار و خیالات کی اثر پذیری کا بڑا دخل رہا۔ عالمِ عرب سے باہر وہ علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) کے فکر و فلسفہ سے بھی گہرے طور سے متأثر نظر آتے ہیں۔ [7]

علوم کی اسلامی تشکیل

اسماعیل راجی الفاروقی نے مغربی جامعات سے فلسفہ، تقابلِ ادیان اور تاریخ کے شعبوں میں تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اپنے مطالعہ و مشاہدے اور ذاتی تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مغربی علوم اپنی ماہیت میں اسلامی نظریۂ حیات و کائنات سے متصادم ہیں، چنانچہ ان علوم کی تعلیم و تدریس ملتِ اسلامیہ کی نوخیز نسل کو راہِ ارتداد پر ڈالنے کا ایک نہایت مؤثر اور طاقت ور ذریعہ بن گئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ تخیل بڑی قوت اور طاقت سے پیش کیا کہ اسلام کے اصول واقدار کی روشنی میں جدید علوم کی تشکیل کی جانی چاہیے۔ [8] گو اسماعیل راجی الفاروقی کے پیش رو مفکرین میں سے معروف نومسلم محمد اسد (1900ء-1992ء) اور سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جدید سماجی اور سائنسی علوم کو الحاد سے پاک کرنے اور انہیں اسلامی نظریۂ حیات کے تابع کرنے کی ضرورت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا، لیکن اس تخیل کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں کا سہرا اسماعیل راجی الفاروقی کے سر بندھتا ہے۔ انہوں نے اس غرض سے اپنے رفقاء عبدالحمید ابو سلیمان، طٰہٰ جابر العلوانی، اور جمال برزنجی وغیرہ کے تعاون سے 1981ء میں عالمی ادارۂ فکر اسلامی (International Institute of Islamic Thought) کے نام سے ایک ادارہ امریکہ کی ریاست ورجینیا میں قائم کیا۔ [9]

علوم کی اسلامی تشکیل کے عملی اقدامات

ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی نے علوم کی اسلامی تشکیل کے لیے بنیادی تصورات پیش کیے اور اس کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات بھی تجویز کیے۔ وہ تجاویز مندرجہ ذیل ہیں:

جدید علوم کامل دسترس: جدید علوم پر دسترس حاصل کرنا علوم کی اسلامی تشکیلِ جدید کی طرف پہلا قدم ہے۔ اسی سلسلے میں توضیحی اور تنقیدی جائزے کے ذریعہ اصولوں اور مسائل کا فہم حاصل کیا جائے۔ [10]

مضامین کا جائزہ: دوسرا قدم یہ ہے کہ مغربی علوم کے ہر مضمون کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اس کے تاریخی ارتقاء، نشو ونما، لکھنے والے مفکرین اور ان کی تحریروں کا جائزہ لیا جانا چاہیے، تاکہ ان کے تمام خدوخال اور پہلو نمایاں ہوسکیں۔ [11]

اسلامی ورثۂ علم پر کامل دسترس: علوم کی اسلامی تشکیل کے سلسلہ میں یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اسلامی علمی ورثہ اس مضمون کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اسلامی علمی ورثہ سے استفادہ کو اسلامی تشکیل کی راہ کا نقطہ آغاز ہونا چاہیے۔ اگر اسلاف کی بصیرت اور نکتہ رسی کو نظر انداز کر دیا جائے اور ان کی علمی کاوشوں سے استفادہ نہ کیا جائے تو علوم کی اسلامی تشکیل کا عمل مکمل نہ ہو گا۔ [12]

شعبہ ہائے علوم میں اسلام کی متعین رہنمائی کا ادراک

علوم کی اسلامی تشکیل کا یہ اگلا قدم ہے جس میں علمی ورثہ کا تجزیہ ضروری ہے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مختلف علوم کے فروغ میں اسلام کے علمی ورثہ کا کتنا حصہ ہے اور عموماً ان علوم کے مقاصد کی تکمیل میں اسلام کے فہم کا کیا کردار ہے۔ ایسے تمام مباحث کو ضروری حوالوں کے ساتھ بیان کیا جائے اور موضوع سے متعلق اسلام کی رہنمائی کی نشاندہی کی جائے۔

اس شعبۂ علم کے اہم سوالات کا جواب تلاش کرنا ہو گا۔ مثلاً ماضی کے علماء نے موضوع کی کن جہات اور ابعاد پر غور کیا ہے اور کیا کیا نتائج پیش کیے ہیں؟ مسلمانوں کی تحقیقات نے کس حد تک اس موضوع کا حق ادا کیا ہے؟ اور وہ کون کون سی جہات ہیں جن میں اسلامی ورثہ کا حصہ کم ہے۔ [13]

جدید علوم کا تنقیدی محاسبہ

جدید مغربی علوم کا اسلامی نقطہ نظر سے تنقیدی تجزیہ کیا جائے۔ علوم کی اسلامی تشکیل کے سلسلہ میں یہ اہم قدم ہے۔ اس مرحلے پر جدید علوم کے بنیادی اصولوں اور نظریات کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے اور ان کے طرقِ کار اور مسائل کے فہم کا تجزیہ کرنا بھی ضروری عمل ہے اور اس کے بغیر چارہ نہ ہے۔ [14]

اسلامی ورثہ کا تنقیدی جائزہ

اسلامی ورثہ میں اولین درجہ پر قرآن کریم اور سنّتِ رسول ﷺ ہیں جو تنقید و تبصرہ سے بالاتر ہیں۔ ان دو کے علاوہ مسلم مفکرین اور علماء کی تحقیقات اور ان کی علمی کاوشیں ہیں۔ وہ تنقید و تجزیے سے بالاتر نہیں ہیں، انہیں قرآن وسنت کی کسوٹی پر رکھ کر ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو واضح کیا جائے۔ [15]

امت کے مسائل کا جائزہ

گزشتہ دو صدیوں سے امّتِ مسلمہ کو بے شمار چیلنجز درپیش ہیں۔ یہ چیلنجز سیاسی نوعیت کے بھی ہیں اور اقتصادی و اخلاقی نوعیت کے بھی۔ لیکن ان میں فکری چیلنجز زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ امت کے مسائل اور ان کے سد باب کے لیے ان کے اسباب و عوامل کو جاننا ضروری ہے۔ حل کی کوششوں کے نتائج کا تجربی اور تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ نیز علم سے بصیرت کے ذریعے امت کے مسائل کو حل کیا جائے۔ [16]

انسانیت کے مسائل کا جائزہ

علوم کی اسلامی تشکیل کی جانب یہ ایک اور اہم قدم ہے کہ نوع انسانی کے مسائل کا احاطہ کیا جائے۔ امّتِ مسلمہ پر صرف اپنی فلاح و بہبود کی ذمہ داری نہیں، بلکہ تمام انسانیت کی بھلائی مطلوب ہے۔ اسلام کے حامل ہونے کی حیثیت سے امت کے پاس وہ بصیرت پائی جاتی ہے جو بنی نوع انسان کی کامیابی اور خوش حالی کے لیے ناگزیر ہے اور اسی سے استفادہ کر کے انسانیت کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ [17]

تخلیقی تجزیہ

مذکورہ بالا اقدامات کے بعد مسلمان اہلِ فکر تخلیقی کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لیے نئی راہیں تلاش کرنا پڑیں گی۔ اور یہ سب تخلیقی بصیرت کے ذریعہ سے ہی ممکن ہو گا۔ [18]

پروفیسر سیّد محمد سلیم

پروفیسر سید محمد سلیم کی ولادت اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق 15 دسمبر 1923ء کو ہوئی، لیکن پروفیسر صاحب کی اپنی تحریر کے مطابق ان کی والدہ ماجدہ کے مطابق ان کی ولادت 28 محرم الحرام 1341ھ ہے جو کہ 22 ستمبر 1922ء کے مطابق ہے۔ آپ کا نام آپ کے ماموں قاضی عماالدین نے عبدالسلیم رکھا یہی نام تمام اسناد میں درج ہے۔ بعد میں آپ کو جب علم ہوا کہ سلیم اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے نہیں ہے تو

آپ نے اسے بدل کر محمد سلیم رکھ لیا۔

آپ کی تعلیم کا آغاز ستور کے مطابق قرآنِ حکیم سے ہوا، اور آپ کو حافظ عبدالصمد نابینا کے پاس بٹھایا گیا۔ ناظرہ قرآن کریم ختم کرنے کے بعد آپ سکول میں داخل ہوئے۔ غالباً 1931ء میں سکول میں داخل ہوئے، ابتدائی درجہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دوسرے سال ہی تیسری جماعت میں داخل ہو گئے۔ تیسری جماعت میں اردو کا آغاز ہوا اور ساتویں جماعت سے فارسی شروع ہو گئی۔ 1938ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ اس سے اگلے سال آپ نے مولوی فاضل (عربی) کا امتحان بھی جامعہ پنجاب سے ہی پاس کر لیا۔

اس دوران اسکول کی تعلیم بھی جاری رہی، 1940ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ 1942ء میں عربک کالج دہلی سے انٹر میڈیٹ کا اور 1944ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لے لیا اور 1946ء میں وہاں سے ایم اے عربی کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ درجہ اوّل میں پاس کر لیا۔ یونیورسٹی میں آپ کی تیسری پوزیشن تھی۔ اسی سال آپ نے ایل ایل بی کا مشکل امتحان بھی دیا اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا سید امتیاز علی مرحوم، مولانا عبدالعزیز میمن، اور مرزا محمود بیگ وغیرہ شامل ہیں۔

اس ماہرِ تعلیم، محقق و نقاد، سیرت نگار اور مؤرخ نے ۲۷ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور اگلے روز کراچی میں پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہو گیا۔

عادات و خصائل

پروفیسر سید محمد سلیم اخلاص وللہیت، صبر واستقامت، سادگی وانکساری، بردباری و تحمل، ایثار و جفاکشی میں اسلاف کی مثال تھے، توسنجیدگی ومتانت، اخلاص و تقویٰ، مروت ولحاظ، قوتِ حافظہ اور وسعتِ مطالعہ کے لحاظ سے بھی سلفِ صالحین کا عملی نمونہ تھے۔ قحط الرجال کے اس دور میں آپ کا دم بہت سی وجوہ سے غنیمت تھا۔ دیکھا جائے تو آپ کی سب سے بڑی خوبی اخلاص وللہیت تھی، آپ نے ساری زندگی یہی اُصول رکھا کہ دنیا اور اہلِ دنیا سے نہ ستائش کی تمنّا رکھی جائے نہ ہی صلے کی پرواہ رکھی جائے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے اوقات میں بھی برکت ڈال دی تھی۔ آپ نے پوری زندگی میں اللہ کی رضا کو ہر ایک چیز سے مقدم جانا اور ہر عمل کامل اخلاص سے انجام دیا۔

آپ نے پوری زندگی میں بیسیوں کتب اور سینکڑوں مقالے اور مضامین تحریر کیے، مگر کبھی بھی ان سے ادنی مالی منفعت کا خیال تک پیدا نہیں ہوا، جو کتاب جس نے اشاعت کے لیے مانگی، اُسے دے دی حتیٰ کہ اس کتاب کے حقوق تک اپنے پاس نہ رکھے بلکہ کتاب یا مضمون کی کاپی تک اپنے پاس محفوظ نہیں رکھی۔ آپ کی اکثر کُتب ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئیں، جن سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی۔ آپ کا واحد مقصد علومِ دینیہ کا فروغ اور رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ یہ وصف آپ کی تمام کتب میں نمایاں نظر آتا ہے، اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''مغربی فلسفۂ تعلیم'' کے تنقیدی مطالعہ میں حرفِ آغاز کے تحت یہ جملے اس دل سوزی سے تحریر فرمائے۔

تعلیمی خدمات

پروفیسر محمد سلیم کی خدمات میں سب سے اہم کام اُن کی سیرت پر کتب ہیں، سیرت پر ان کی کتب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس پہلو پر ہیں یا زیادہ اس پہلو کے گرد گھومتی ہیں جن پر ہمارے ہاں بہت کم لکھا گیا ہے۔ آپ نے جن شعبوں کو خصوصیت سے منتخب کیا ان میں

عہدِ نبوی ﷺ، آپ ﷺ کا تصورِ تعلیم، اور آپ ﷺ کا طریقِ تعلیم و تربیت ہے۔ اس کے علاوہ فنونِ لطیفہ اور سیرتِ طیبہ کے تعلق پر بھی آپ نے کافی وقیع کام کیا ہے۔ ذیل میں آپ کی ان کتابوں اور مضامین کا ذکر کیا جاتا ہے، جو سیرتِ طیبہ یا اس سے متعلقہ موضوعات ومباحث پر مشتمل ہیں، یا ان کا کچھ حصہ ان مباحث پر ہے:

ہند و پاک میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم، اس میں دوسرا باب اسلامی نظامِ تعلیم کی خصوصیات، تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے، عہدِ اسلامی کے عظیم مدارس، اس میں اسلامی نظامِ تعلیم کے حوالے سے چند مباحث اور پھر مسجدِ نبوی ﷺ کا ذکر ہے، قومیت و وطنیت، اس مختصر کتاب میں تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں اسلام کا تصورِ قومیت واضح کیا گیا ہے، تاریخ نظریۂ پاکستان، اس کا پہلا باب تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے۔ اسلام کا نظامِ تعلیم، عہدِ رسالت، عہدِ خلاف راشدہ، عہدِ بنی امیہ، مسلمانوں کا نظامِ تعلیم، پہلی صدی ہجری میں، اسلامی تعلیم بنیادی تصورات وافکار، پوری کتاب کے مباحث قرآن وحدیث سے مستنبط ہیں، رسولِ اکرم ﷺ کا اسوۂ تعلیمی، اسلام کا نظریۂ تعلیم، یہ کتاب بعد میں ایک دوسری کتاب اسلامی تعلیم کے بنیادی تصورات وافکار کا حصہ بن گئی، اسلام کا فلسفۂ تعلیم، جہانی نقطۂ نظر، تصورِ کائنات و تصورِ انسانی۔

ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس

ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس دورِ جدید میں عالمِ اسلام کے کے ممتاز مفکر، ادیب، ماہر تعلیم، مؤرخ اور فلسفی ہیں۔ آپ اسلامی اور دیگر مذہبی علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ 60 سال سے زائد عرصہ سے وہ درس وتدریس اور تحقیق وتدوین کے ذریعے اسلامی فکر کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ آپ نے 27 سال سے تحقیقی اور فکری نوعیت کی کتب لکھیں اور اسلامی فکر، تصوف، تعلیم، مابعد الطبیعات، فلسفہ، مالی زبان وادب کو فکر و تحقیق کا موضوع بنایا۔

ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس 5 ستمبر 1931 کو بوگر جاوا (انڈونیشیا) کے مقام پر ایک روحانی سلسلہ سے تعلق رکھنے والے خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم 5 سال کی عمر سے شروع کی۔ اس کے بعد مدرسہ العروۃ الوثقیٰ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں انہوں نے عربی زبان وادب کے تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس کو بچپن ہی سے مذہب، زبان وادب، تاریخ اور مغربی فکر سے دلچسپی تھی۔ بعد ازاں آپ کو مگگل یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کینیڈا کونسل فیلوشپ ملی۔ 1962ء میں آپ نے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ یونیورسٹی آف لندن چلے گئے جہاں سے آپ نے مشہور پروفیسر اے۔ جے۔ آربیری کی سرپرستی میں The Mysticism of Hamzah Famsuri کے عنوان پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔[19]

تدریسی و فکری خدمات

تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس ۱۹۶۶ء میں وطن واپس لوٹے اور مالیا یونیورسٹی کے شعبہ مالیا کے سربراہ بن گئے۔ اس کے بعد 1968ء سے 1970ء تک فیکلٹی آف آرٹس کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے جہاں بعد میں آپ کو ملیشیاء کی قومی یونیورسٹی نے شعبہ مالیا زبان وادب کا سربراہ بنادیا۔ 1975ء میں ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس نے مالی زبان وادب اور کلچر کے متعلق ایک ادارہ قائم کیا۔ آپ نے مالی زبان وادب کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں۔ وہ نظام تعلیم میں انگریزی کی بجائے مالی زبان کو ذریعہ ابلاغ بنانے کے خواہاں تھے۔ 1975ء میں امپیریل

ایرانین اکیڈمی آف فلاسفی نے آپ کو تقابلی فلسفہ میں فیلو بنایا۔ اس کے علاوہ آپ نے بہت سی تحقیقی اور علمی کانفرنسز میں اہم کردار ادا کیا۔ 1976ء میں آپ ٹمپل یونیورسٹی فلاڈفیا، امریکہ کے وزٹنگ پروفیسر رہے۔ اردن کے ولی عہد نے انہیں 1996ء میں رائل اکیڈمی آف جارڈن کارکن بنایا۔ خرطوم یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے بھی نوازا۔

تصنیفات

ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس کی اہم اور نمایاں تصنیفات میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

Prolegomena to the Metaphysics of Islam, The Intution of Existance, The Mysticism of Hamzah Fansuri, Islam and Secularism, The nature of Man and the Psychology of the Human Soul, Islam" the Concept of Religion and the Foundation of Ethics and Morality, The Degrees of Existance, The Concept of Education in Islam, Islam and the Philosophy of Science.

ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس کی نظر میں سیکولرزم اور سیکولرائزیشن

ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس نے اپنی کتاب Islam and Secularism میں جدیدیت کے جن عناصر کا تفصیل سے جائزہ لیا، ان میں سیکولرزم اور سیکورائزیشن سر فہرست ہے۔ سیکورزم کا ادعا ہے کہ اگر کوئی اللہ اور رسول کو مانتا ہے تو وہ اپنی انفرادی زندگی میں مان لے لیکن خدا اور رسول کو اجتماعی زندگی میں دخل اندازی نہ کرنے دے۔ ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس کا ماننا ہے کہ سیکولرائزیشن انسان کو خدا اور مذہب سے الگ کرنے کا نام ہے اور یہ علیحدگی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہے۔ انہوں نے سیکولرائزیشن کے تین بنیادی عناصر کا تذکرہ کیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہی جدیدیت کے نقائص ہیں۔[20]

Disenchantment of Nature: یہ پہلا عنصر ہے۔ یعنی کائنات کے فہم کو مذہبی تصورات اور حدود وقیوّد سے آزاد کیا جائے۔ اس نکتے کے مطابق کائنات کسی مافوق الفطرت ہستی کی تخلیق کردہ نہیں اور نہ ہی کسی ایسی ہستی سے وابستہ ہے۔

The Desacralization of Politics: یہ دوسرا عنصر ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ سیاسی معاملات کو مذہب اور خالق کائنات سے علیحدہ رکھا جائے۔ سماجی اور سیاسی مسائل اور قوانین کو مذہبی تقدّس سے علیحدہ کر کے ہی انسان ترقی کر سکتا ہے۔ اس نکتے کو عیسائی دنیا نے قبول کیا اور اسی کو وہ باقی ماندہ دنیا میں لاگو کرنا چاہتی ہے۔

Deconsecration of Values: یہ تیسرا عنصر ہے، اس عنصر کے مطابق اقدار بالخصوص اخلاقی اقدار اور خیر وشر سے تعلق نہیں ہے۔ انسانی پسند وناپسن کو معیار بنانا چاہیے اور انسانی فلسفوں پر انحصار کرنا چاہیے۔ آپ نے مغرب کے تصور عقل پر بھرپور تنقید کی جو جدیدیت کا اصل روح ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ جدیدیت اور جدید دور کا کارنامہ ہے کہ تعلیم و تعلم نے فطرت، خالقِ کائنات اور مابعد طنیعات سے منہ موڑا۔

الغرض ڈاکٹر سیّد محمد نقیب العطاس کے مطابق مغربی فکر اور تہذیب غالب ہے۔ اس کا غلبہ سیاسی، معاشی اور عسکری ہی نہیں بلکہ فکری بھی ہے۔

یہی تہذیب پوری دنیاپر چھائی ہوئی ہے۔آج ہمارانظامِ تعلیم اور تعلیمی نصابات کاسارڈھانچہ مغربی افکار کے سائے تلے پروان چڑھ رہاہے۔اس نظامِ تعلیم نےاذہان کوپس وپیش اورتذبذب میں مبتلا کردیاہے کیونکہ یہ مغرب کے ملحدانہ افکار (سیکولرزم،لبرلزم اور کمیونزم) پر مبنی ہے۔جدید نظامِ تعلیم مؤحد ، معتدل اور باشعور شخصیات پیدا کرنے میں ناکارہاہے اوراس نے ہر طرف فکری انتشار اور ژولیدگی کوپروان چڑھایاہے۔عالمِ اسلام کے ہر کونے میں اسی نظامِ تعلیم کو فوقیت دی جاتی ہے۔نصاب سازی کاکام مغربی طرز کے مطابق طے پاتاہے۔ تعلیم وتعلم کے اغراض ومقاصد وہی طے پاتے ہیں جو مغرب چاہتاہے۔قوموں کی پالیسیزاور منصوبے اسی نظامِ تعلیم کے نتیجے میں بنائے جاتے ہیں۔

سیّد حسین نصر

پروفیسر سید حسین نصر کا شمار سائنس، عرفان اور فلسفۂ اسلامی کے صف اول کے ماہرین میں ہوتاہے۔آپ جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔آپ 7اپریل1933ء کو تہران میں ڈاکٹرزاور علمائے دین کے ایک گھرانے میں پیداہوئے۔آپ کے والد سید ولی اللہ انتہائی نیک اور متقی شخص تھےاور ایران میں شاہی خاندان کے ایک اعلیٰ پائے کے معالج تھے۔لفظ "نصر" کالفظی مطلب فتح ہے، یہ نام لقب کے طور پر سید حسین نصر کے دادا کو شاہ فارس کی طرف سے عطا کیاگیا۔ سید حسین نصر کا تعلق صوفیاء کے خاندان سے بھی ہے۔آپ کے آباء واجداد میں سے سید محمد تقی کاشان کے ایک بہت بڑے درویش ہو گزرے ہیں، جن کا مقبرہ بادشاہ شاہ عباس کے مقبرے کے بالکل ساتھ ہےاور آج بھی زائرین اس پر حاضری دیتے ہیں۔

تعلیم وتدریس

سید حسین نصر نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر کے ساتھ ملحقہ سکول میں ہی حاصل کی۔اس کے بعد مزید ابتدائی تعلیم کے مراحل ایران اور امریکامیں طے کیے۔سید حسین نصر کی ابتدائی تعلیم میں ایران کے معمول کے نصاب اور مذہبی تعلیم کے علاوہ فرانسیسی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔نصر کی ابتدائی تعلیم لگ بھگ اس کی عمر کے ابتدائی بارہ سال تک جاری رہی۔بارہ سال کی عمر میں تعلیم کے حصول کے لیےامریکہ آجاناسید حسین نصر کی زندگی میں ایک نئے دور کاآغاز ثابت ہواجواس کی ابتدائی ایرانی زندگی کانہ صرف اختتام تھابلکہ ایرانی زندگی سے بہت زیادہ مختلف بھی تھا۔اس نےہائی سٹن، نیوجرسی کے The Peddle سکول میں داخلہ لیااور یہاں سے ۱۹۵۰ء میں Wyclifte Award ایوارڈ جیتاجوکہ اس ادارے کاسب سے بڑاایوارڈ تھا۔ہائی سٹن،نیوجرسی کے The Peddle سکول میں چار سالہ تعلیم کے دوران ہی سید حسین نصرنے امریکن ہسٹری، عیسائیت، انگریزی زبان وادب اور سائنس کے علاوہ مغربی علوم وفنون سیکھے۔ اس کے بعد سید حسین نصر نے کالج کی تعلیم کے لیے ماساچوسٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (MIT) کاانتخاب کیاسید حسین نصر پہلاایرانی نوجوان تھاجسے انڈر گریجویٹ تعلیم کے حصول کے لیے کسی بھی امریکی یونیورسٹی کی طرف سے سکالرشپ دیاگیا۔اور اس ادارے میں فزکس اور ہارورڈ یونیورسٹی میں جیالوجی اور جیوفزکس کے مضامین میں اپنی تعلیم جاری رکھی اور بالآخر موخرالذکر دانشگاہ سے25سال کی عمر میں ہی Phliosophy and History of Science میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سائنس اور اسلامک کاسالوجی اس سلسلے میں آپ کی تحقیق کے خصوصی موضوع تھے۔آپ کے پی ایچ ڈی مقالہ کاعنوان "Conceptions of Nature in Islamic

"Thought" تھا جو ہاورڈ یونیورسٹی کے پریس سے 1964ء میں شائع ہوا۔ سید حسین نصر کو اسی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی گئی لیکن آپ نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مستقل طور پر واپس ایران آنے کا فیصلہ کیا۔

فکری تشکیل

ڈاکٹر حسین نصر 1958ء سے 1979ء تک تہران یونیورسٹی میں تاریخِ علم و فلسفہ کے استاد رہے۔ وطن واپسی پر آپ نے ایک معزز خاندان میں شادی کر لی، اس خاندان کے افراد سید حسین نصر کے خاندان کے قریبی دوست تھے۔ پانچ سال بعد تیس سال کی عمر میں سید حسین نصر یونیورسٹی کے کم عمر ترین پروفیسر بن گئے۔ آپ نے تہران یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کو وسعت دینے اور اس کی بہتری کے لیے پروفیسر کے طور پر اپنی حیثیت کا بھرپور استعمال کیا۔ چونکہ اس وقت تہران یونیورسٹی ایران میں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی تعلیم کی واحد درسگاہ تھی، اس لیے ڈاکٹر حسین نصر کی ان تبدیلیوں اور اقدامات نے شعبہ فلسفہ پر گہرے، دور رس اور مثبت اثرات ثبت کیے۔ نصر کے اس نظریے کو، کہ ایرانی طلباء کو فلسفہ کا مضمون اپنی تاریخ اور روایات کے تناظر میں پڑھنا چاہیے نہ کہ مغربی نقطۂ نظر سے، نہ صرف ایران کی دیگر جامعات نے بھی اختیار کیا بلکہ اس نظریہ کے اثرات آج بھی ایرانی طلباء اور جامعات پر بہت گہرے ہیں۔ فلسفہ کے پروگرام کے علاوہ، ڈاکٹر حسین نصر تہران یونیورسٹی میں فارسی زبان وادب میں بھی ڈاکٹریٹ کے پروگرام کے آغاز کے لیے سرگرم رہے، ان کا مؤقف تھا کہ چونکہ فارسی ان کی مادری زبان ہے اس لیے اس زبان میں بھی ڈاکٹریٹ پروگرام شروع ہونا چاہیے۔ مزید 1968ء سے 1972ء تک ڈاکٹر حسین نصر کو فیکلٹی ڈین مقرر کیا گیا اور بعد میں آپ کو کچھ عرصہ کے لیے وائس چانسلر بھی بنایا گیا تو آپ کی ان حیثیتوں سے زیادہ تر توجہ شعبہ آرٹس کے مضامین کی طرف بالعموم اور فلسفہ اور فارسی کے مضامین کی طرف بالخصوص رہی تاکہ انہیں مضبوط بنایا جاسکے۔

1972ء میں امریکن یونیورسٹی بیروت میں قائم آغاخان چیئر فار اسلامک اسٹڈیز کے لیے جس شخص کا سب سے پہلے انتخاب عمل میں آیا وہ آپ ہی تھے۔ آپ سابقہ آریامہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ اس کے علاوہ آپ کو ایران کی انجمن فلسفہ کے بانی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ 1979ء میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے زمانے میں پروفیسر سید حسین نصر ایران سے امریکا منتقل ہو گئے جہاں ابتدا میں آپ ٹمپل یونیورسٹی فلاڈلفیا میں پڑھاتے۔

ڈاکٹر حسین نصر نے فارسی اور انگریزی زبان میں بہت زیادہ لکھا اس کے علاوہ انہوں بعض مواقع پر عربی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی لکھا۔ آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی فارسی زبان میں ہے اور اس مقالہ کے فارسی میں ہونے کی بدولت ہی آپ نے Royal Book Award جیتا۔ 1966ء میں آپ کو شکاگو یونیورسٹی میں راک فیلر (Rockfeller) لیکچر دینے اور مذہب، فلسفہ اور ماحولیاتی بحران کے درمیان تعلق کے بعض پہلوؤں پر بات کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس دعوت کا ہی نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر حسین نصر نے Man and Nature: The Spiritual Crisis of Modern Man لکھی جو مندرجہ بالا عنوان کی سائنسی اور فلسفیانہ بنیادوں سے بحث کرتی تھی اور یہی کام اس موقع پر متوقع ماحولیاتی بحران پر کیا گیا سب سے بہترین کام تھا۔

حال ہی میں سید حسین نصر نے اسلامی اور یہودی فلسفہ کے ایک برطانوی سکالر Oliver Leamon کے ساتھ مشترکہ طور پر دو جلدوں پر مشتمل اعلیٰ پائے کے مختلف مصنفین کی تحریر کردہ ایک کتاب History of Islamic Philosophy

میں ایڈیشن کیاہے۔ سید حسین نصر دینی امور میں بحث و تمحیص کے شوق نے آپ کو مشہور عیسائی، یہودی، ہندواور بدھ مذاہب کے دانشوروں اور متکلمین سے مذاکروں اور مباحثوں کی طرف راغب کیا۔ نصر سائنس، فلسفہ، عرفانِ اسلامی، نیز روایت وجدیدیت کے موضوعات پر متعدد کتابوں اور مقالات کے مولف ہیں۔ "قلبِ اسلام" ان کی تازہ ترین کتاب ہے۔ آپ ادارۂ مطالعات روایت پرستی، جس کا کہ امریکا میں مرکز ہے کے سربراہ ہیں۔ مختلف ادیان کی روایات کے بارے میں ایک مجلہ بنام "سوفیا" بھی اسی مرکز سے شائع ہوتاہے۔ آپ بیسویں صدی کے ایک الجزائری صوفی (شیخ احمد العلوی) سے بیعت ہیں۔

تصنیفی وتالیفی کام

سید حسین نصر کے مندرجہ بالا تعلیمی، تصنیفی اور تالیفی کارناموں کے علاوہ اور بھی کئی اہم کام تصنیفی اور تالیفی کارنامے سرانجام دیئے جن میں چند ایک کاذیل میں تذکرہ کیاجاتاہے:

The Garden of Truth, Knowledge and the Sacred, Islamic Arts and Spirituality, Ideals and Realities of Islam, The Study Quran, Man and Nature, Islamic Science, Islam and the Plight of Modern Man, Islamic Philosophy from its origin to the Present, History of Islamic Philosophy, Science and Civilization in Islam, Islmic Life and Thought, Sufi Essays, Islam in the Modern World, Trdaitional Islam in Modern World, Prophet Muhammad Man of God, Mecca the Blessed, Medinah the Radiat; The Holies Cities of Islam, Western Science and Asian Cultures, Islam, Science, Musilms and Technology, The Pilgrimage of Life and the Wisdom of Rumi.

ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسی جلیل القدر شخصیات نے جنم لیا، جنہوں نے نہ صرف امّتِ مسلمہ کی خلوص کے ساتھ رہنمائی کی بلکہ اس امّت کو زوال کی پستیوں سے باہر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان نفوسِ قدسیہ میں ایک قابل ذکر نام ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی کا بھی ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی جدید دور کے ایک نامور مفکر اور جیّد عالمِ دین تھے، جنہوں نے فکرِ اسلامی کے ارتقاء اور اس کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ جن اہم موضوعات کی وجہ سے دنیا بھر میں معروف ہوئے، ان میں تعلیم کی اسلامائزیشن، فقہ الاقلیات، اسالمی فکر، اجتہاد و تجدید، امّتِ مسلمہ کا فکری بحران، مقاصدِ شریعت، معاصر اسلامی تحریکات اور اصولِ فقہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پیدائش اور ابتدائی حالات

ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی 1953ء میں عراق کے شہر فلوجہ کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق مقامی مکتب سے حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے بغداد میں اپنے وقت کے ایک جلیل القدر اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔ آپ کے اساتذۃ میں شیخ امجد الزھاوی، شیخ القاسم القیسی، شیخ عبدالقادر الخطیب اور شیخ محمد الفواد آلوسی قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد آپ مزید تعلیم کی تلاش میں مصر چلے گئے۔ مصر میں

آنے سب سے پہلے 1959ء میں جامعہ الازہر سے گریجوایشن مکمل کیا اور اس کے بعد 1961ء میں ایم۔اے اور پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ الازہر میں تعلیم کے حصول کے دوران آپ کی فکر پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مصر میں مختلف مکاتیبِ فکر کے ساتھ رابطے کی وجہ سے آپ کے تحقیقی و تنقیدی شعور میں کافی وسعت آگئی۔آپ نے اسلامی فکر کے نئے پہلوؤں پر غور و فکر شروع کر دیا۔آپ نے مصر کی علمی اور تحقیقی فضا میں اخوان المسلمین کی فکر سے واقفیت حاصل کی اور اس کے رہنماؤں کی نگارشات پڑھیں۔ حزب التحریر، حزب الدعوۃ، سید محمد باقرالصدر ، مولونامودودی ، سید ابوالحسن ندوی ، مالک بن نبی اور بیشتر دیگر مفکرین کے نظریات کو بھی مطالعہ کیا۔ نقلی علوم کے ساتھ ساتھ جدید افکا کا بھی مطالعہ کیا۔ شیخ احمد کوٹے آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Dr. Taha Alwani was one of the few scholars deeply grounded in Islamic sources while being aware of modern thought, concepts and ideas"[21]

6مارچ 2016ء کو قاہرہ اور واشنگٹن کے سفر کے دوران میں ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کی بیٹی ڈاکٹر زینب العلوانی کے مطابق ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی کے آخری الفاظ یہ تھے:

"الاسلام غایتی والامان مطلبی، والارهاب عدوی، والصراع خصمی والامن والطمانية مطلبی، فهل غرفته؟

وهل تعرف لی علی هذة الارض نظیر اوشبیها؟ انامسلم۔" [22]

"امن میرا مقصد ہے، امن وامان اور تحفظ میرا مطالبہ ہے، دہشت گردی میری دشمن ہے، جنگ وجدال میرا حریف ہے"۔

امن اور اطمینانِ قلب ہی میری تلاش ہے، تو کیا آپ نے مجھے پہچانا؟ اور کیا اس زمین پر کوئی اور میرے جیسا موجود ہے؟ میں مسلمان ہوں۔

علمی سرگرمیاں

تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی نے عراق میں ایک ملٹری سکول میں استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ایک مقامی کالج میں پروفیسر بھی رہے۔ اس کے بعد آپ سعودی عرب چلے گئے، جہاں آپ امام محمد سعود یونیورسٹی، ریاض میں ۹ سال تک اسلامی قانون کے پروفیسر رہے۔ اس دوران آپ نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور اپنے تحقیقی اور علمی نوعیت کے مقالات پیش کیے۔ 1983ء میں آپ امریکہ تشریف لے گئے تاکہ مغربی دنیا کو فکرِ اسلامی سے متعارف کرایا جاسکے۔ امریکہ میں آنے 23 سال تک فکرِ اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر کام کیا۔ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس میں اپنی گہری نظر اور عمیق فکر کا مظاہرہ کیا اور اس موضوع کا پوری طرح سے حق ادا کر دیا۔

آپ نے امّت اور مسلم سماج کے بارے میں اپنی فکر مندی کا اظہار کیا۔ فکرِ اسلامی کی اصلاح کے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آج جن سخت حالات سے امّتِ اسلامیہ گزر رہی ہے اور جس مشکل وقت میں امّت جی رہی ہے، اس میں فکری مسائل کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ ناکامیوں کا تسلسل اور بے توقیری کا احساس بتارہا ہے کہ اگر اس امّت کی فکر درست نہ ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا جو آج پیش آرہا ہے۔ آج اس امت کو ہوا اور غذا کی طرح فکری اصلاح اور تہذیبی وثقافتی استحکام کی ضرورت ہے"۔ [23]

ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی نے مغربی ممالک میں سکونت پذیر مسلم اقلیات کے مسائل کو بھی زیرِ بحث لا کر ان کا مناسب حل نکالنے کی کوشش کی۔آپ دورِ جدید کے ایک ایسے فقیہ تھے جنہوں نے فقہ القلیات پر باضابطہ اور مدلل تحقیقی کام کیا۔اصولِ فقہ کو آپ نے ریسرچ و تحقیق کا خاص موضوع بنایا اور غور و فکر کے اہم نکات بھی پیش کیے۔انہوں نے اختلاف اور اس کی حقیقت پر اہم اصول اور ضوابط بھی پیش کیے۔آپ باہمی اختلافات کو امّت کے زوال کا ایک اہم سبب مانتے ہیں۔آپ مسلم ممالک میں مسلکی تشدد کے سخت خلاف تھے۔خاص طور پر شیعہ سُنّی تفرقہ بازی سے آپ شاکی تھے۔ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی کے نزدیک امّت کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ محض مدافعانہ کوششوں سے نہیں ہو سکتا اور نہ ہی جدید افکار کو اختیار کرنے سے ہو سکتا ہے۔بلکہ فکری و تحقیقی اور علمی و تعلیمی کوششوں سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

تصنیفات

ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی کا ایک اہم کام امام فخر الدین رازی کی معروف تصنیف المحصول من علم اصول الفقہ میں ترامیم کر کے چھ جلدوں میں اس کی طباعت ہے۔اس کے علاوہ آپ نے اسلامی فکر پر مندرجہ ذیل کُتب بھی شائع کیں:

ادب الاختلاف فی الاسلام، الازمة الفکریة المعاصرة، الجمع بين القرأتين: قرأة الوهی وقرأة لکون، الوحدة البائية القرآن المجید، لااکراہ فی الدین، مقدمة فی الاسلامية امعرفة، نحوالتجدید والاجتہاد، اصلاح الفکر الاسلامی، نحومنهجة معرفة قرانية، لسان القرآن والمتقبل الامة القطب۔

فکری پیش رفت

ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی بہت سے علمی، فکری، اصلاحی اداروں اور تنظیموں کے رہنما اور سرگرم کارکن تھے۔ان میں فقہ الاسلامی جدہ، المجلس الفقہی شمالی امریکہ، مسلم ورلڈ لیگ، المعهد العاملی للفکر الاسلامی، آرگنائزیشن آف دی اسلامک کانفرنس قابلِ ذکر ہیں۔ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی نے اپنی ساری توجہ افراد سازی پر دی۔آپ نے 1996ء میں گیجویٹ اسکول آف اسلامک اینڈ سوشل سائنسز (GSISS)، ورجینیا کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد اسلامی فکر اور فقہ کے ماہرین پیدا کرنا ہے اور اس مقصد کے حصول میں آپ کامیاب رہے۔آپ امام شافعی چیئر برائے فقہ مقارن، قرطبہ یونیورسٹی، ورجینیا میں پروفیسر رہے اور اس کے علاوہ اسٹار برگ یونیورسٹی، فرانس، امیر عبدالقادر یونیورسٹی، الجیریا اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملائشیا کے جزوقتی پروفیسر بھی رہے۔

تعلیم کی صورتِ حال پر تبصرہ

ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی نے موجودہ تعلیمی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ موجودہ دور میں دو طرح کے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ایک جدید علوم جن میں سماجیات، طبعیات، کیمیا اور انجینئرنگ وغیرہ شامل ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ان علوم پر مغربی سوچ اور فلسفہ غالب ہے اور علم کی ماہیت، مقاصد اور اصول مغربی فکر کے تناظر میں ترتیب دیئے جاتے ہیں۔جب کہ دوسری طرف ان علوم کی تدریس ہوتی ہے جن کو مسلمانوں نے شریعت سے اخذ کیا ہے۔یہ علوم مضامین کے اعتبار سے تقسیم کر کے پڑھائے جاتے ہیں۔ان کو اسلامی علوم بھی کہا جاتا ہے۔ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی کے نزدیک ان دینی علوم پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے کیونکہ بہت سی کتب جو پڑھائی جاتی ہیں، ان میں اجتہادی بصیرت اور تخلیقی سوچ پروان چڑھانے کی صلاحیت مفقود ہے۔اساتذہ بچوں میں تقلیدی ذہنیت پروان چڑھاتا ہے اور روایتی سوچ کی

پیروی کی تلقین کرتاہے۔ اجتہادی صلاحیت اور خود سے غور وفکر کامادہ ختم ہوتاجارہاہے۔ اس طرح کا تعلیمی ماحول زندگی کے نئے چیلنجوں کاسامنا کرنے میں ناکام ثابت ہورہاہےاوراس طرزِ تعلیم سے طلباء میں تخلیقی سوچ بھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔

ڈاکٹر طٰہٰ جابرالعلوانی مزید ایک جگہ پراس طرح رقمطراز ہیں:

''مسلم دنیامیں دوقسم کے تعلیمی نظام رائج ہیں۔ایک روایتی نظامِ تعلیم جس کواسلامی تعلیم بھی کہاجاتاہے۔یہ ایک فرد کے ذاتی معاملات کی بہتری اور عبادات کی تعلیم تک محدود ہے۔ سماج پر توجہ کم ہے۔دوسری جانب اس کاتدریسی طریقہ اطمینان بخش نہیں۔علوم نقلیہ کی تدریس کے روایتی طریقے امّتِ مسلمہ میں بعد کے دور میں تشکیل دیئے گئےاورانہیں تصحیح واصلاح سے گزارا گیاتوانتشاراور جمود کااندیشہ ہے۔''[24]

علوم کی اسلامی اساس

علم کی اسلامی تشکیل بیسویں صدی میں کثرت سے معرضِ بحث آنے والے موضوعات میں سے ہے تاکہ مغرب کے فکری اور سیاسی غلبہ کے اس دور میں امّتِ مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جدید خطوط پر کام کیا جاسکے۔ علم وتحقیق قوم کی مادی اور ذہنی اٹھان کانشان ہوتے ہیں۔اس لیے مسلم مفکرین نے اس بات پر توجہ مبذول کی کہ مسلمانوں کی علمی وفکری تربیت کی جائے۔ جدید علوم مغرب کی گود میں تیار ہوتے ہیں۔ وحی ان کی اساس نہیں ہے لیکن وہ انسانیت کے قافلے کے ہدی خوان بن چکے ہیں انہیں اسلام کے افکار اور نظامِ اخلاق کی اساسیات پر از سرِنواستوار کرتاہے۔[25] ڈاکٹر طٰہٰ جابرالعلوانی کواس بات کاپختہ یقین تھاکہ امّتِ مسلمہ کے بحران کی بڑی وجہ نظامِ تعلیم کا صحیح خطوط پر استوار نہ ہوناہے۔ انہوں نےڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی اور ڈاکٹر سید نقیب العطاس کی طرح اس صورتِ حال کاامّتِ مسلمہ کاالمیہ قرار دیا۔انہوں نے نہ صرف گہرائی سے غور وفکر کیابلکہ عالمی ادارہ فکر اسلامی سے وابستہ ہوکر عملی کوششیں بھی کیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ جابرالعلوانی نےاسلامائزیشن آف نالج کو وقت کی ایک اہم بحث قرار دیا۔آپ اس اسلامائزیشن کوفکر وتہذیب کی بلندی کے لیےاہم تصور کرتے تھے۔ڈاکٹر طٰہٰ جابرالعلوانی کواُن لوگوں سے اختلاف تھاجو کہتے تھے کہ یہ ایک سطحی بحث ہے۔آپ لکھتے ہیں:

''اسلامائزیشن آف نالج کاموضوع مختلف وجوہ سے زندہ موضوع نہیں بن سکا۔بلکہ کبھی کبھی اس موضوع کو تنقید کاہدف بھی بنایاگیا۔ لیکن جلد ہی تنقیدی آوازیں پست ہونے لگیں کیونکہ خود مغرب کے دانشوروں نےعلوم واقدار کے مابین ربط کی ناگزیریت پر زور دیناشروع کر دیا۔ اہلِ مغرب نےزور دیاکہ سائنس اور مذہب وحکمت کے مابین جدائی نےانسانوں کو شدید نقصان پہنچایاہے'' [26]

ڈاکٹر طٰہٰ جابرالعلوانی نے مناہجِ فکر کی طرف توجہ دلائی۔ علم وآگہی کواسلامی روح میں ڈھالنے کی بات کی۔ان کے نزدیک علم وآگہی وہ چیز ہے جس کی دریافت وحی، حواس یاتجربہ سے ہو۔ ہم وحی کے ذریعے حاصل ہونے والی ہر بات کوعلم قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ جابرالعلوانی کہتے ہیں کہ علم وآگہی کی جو تعریف ملحدین نے کی ہے، ہم اسے قبول نہیں کر سکتے خواہ دنیاکی تمام دانش گاہیں اور معلمین متفق ہوکراس تعریف کو پیش کریں۔آپ کہتے ہیں کہ ہمارامصدر یعنی وحی علمی دنیاکے لیےایک چیلنج ہے۔ اس کااعجاز ہے کہ دنیابھر کے دانشور قرآن حکیم جیسی کتاب یاسورت دنیاکے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ منکرینِ حق کبھی اس چیلنج کاجواب دینے کی جرأت نہیں کر سکے۔اورانہیں اپنی درماندگی کااعتراف بھی کرناپڑا۔[27] ڈاکٹر طٰہٰ جابرالعلوانی علم کی اسلامی تشکیل کی ضرورت ونہج پر گفت گو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ولضروره وجود نظرة منهجية ظهرت اسلاميه المعرفة وهى نشاط فكرى ورؤيۀ ابستمولجية تسعیٰ الى اعادة بشقيهاالانسانيه والطبيعى، بحيث تقوم على اصول اسلامية من حيث الاهداف والنتيجة التطبيق، وتحاول داب

الصدع ومعالجة الشقاق الذى حدث بين قراة الوحى وقراة الكون" [28]

"اسلامی نقطۂ نظر کے تحت علم کی اسلامی تشکیل کا تصور سامنے آیا۔ یہ ایک ایسی منظم، فکری اور دانشورانہ سرگرمی ہے جہاں انسانی اور قدرتی صلاحیتوں کا استعمال اسلامی اصولوں کی بنیاد پر کیا جائے۔ وحی الٰہی کے فہم اور تجرباتی علم کا امتزاج ہو۔ یہ تصور مطالعۂ وحی اور مطالعہ کائنات کے درمیان دوری کو پاٹنے کی سعی ہے"۔

خلاصہ بحث

بیسویں صدی میں امّتِ مسلمہ سیاسی، اقتصادی اور تعلیم وفکری بحران کا شکار ہو گئی۔ اس امّت نے، جس کا اپنا ایک مخصوص نظامِ حیات تھا، دوسروں کی فکر وتہذیب کو اختیار کر لیا۔ اس تناظر میں اسلامی تحریکات ابھرنا شروع ہوئیں اور ان تحریکات نے احیائے اسلام کے مشن کو پروان چڑھانا شروع کیا۔ انہی تحریکات کی بدولت سیاسی، سماجی، معاشی اور فکر وتعلیمی اداروں کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کی سعی کی گئی۔ اصلاحاً اس عمل کو اسلام کاری یا اسلامائزیشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مصر، ایشیاء، عراق اور ایران کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان علاقوں سے ہر شعبہ ہائے زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی سعی بلیغ کی گئی۔ اسلامی تحریکات اور مسلم مفکرین نے جہاں سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعبوں کو اسلام کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی، وہیں مختلف گوشوں سے یہ خیال سامنے آیا کہ صرف سیاسی اور انتظامی ڈھانچوں کو ہی اسلامی سانچے میں ڈھالنا کافی نہیں بلکہ علوم وفنون کی اسلام کاری بھی از حد ضروری ہے۔ اس لیے مسلم مفکرین نے علمی اور فکری سوچ کی بھی اسلام کاری کے لیے سخت محنت کی۔ اسلامائزیشن کی تحریک نے اصلاح اور دعوت کے ساتھ فکری کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس تحریک کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ نظامِ تعلیم چونکہ اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان تعلیمی لحاظ سے تنزلی کا شکا ہیں۔ اس لیے تعلیم کو اسلامیانے کی ضرورت ہے۔

تعلیم کی اسلام کاری کی بحث بیسویں صدی کی چالیس کی دہائی سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے مولانا مودودی نے علوم کا اسلامی نظریہ پیش کیا۔ آپ نے اپنی تحریروں میں خاص کے اپنی تصنیف تعلیمات میں نظامِ تعلیم کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لیے تجاویز بھی پیش کیں۔ مولانا مودودی کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالحسن ندوی نے بھی اس تحریک میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔ پھر 70 اور 80 کی دہائی میں پروفیسر ڈاکٹر سید محمد سلیم، ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی اور ڈاکٹر سید نقیب العطاس نے اس تحریک کو فروغ دیا۔ سید حسین نصر اور ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی نے اس تحریک کو مزید وسعت دی اور انہوں نے اس تحریک کو نہ صرف علمی، فکری، تحقیقی اور منہجی سطح پر متعارف کرایا اور نظریہ تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اس عمل کو علمی طور پر نافذ کرنے لیے یونیورسٹیوں اور اداروں کو قائم کیا۔ اس بحث کو جن مفکرین اور اہلِ علم نے آگے بڑھایا ان میں عبد الحمید ابو سلیمان، لوئی سیف، ابراہیم راغب، مولونا فضل ،امام الدین خلیل، الیس بوئینو، شیخ جعفر ادریس اور علی اشرف قابل ذکر ہیں۔

اسلامائزشن آف نالج کی تحریک سے وابستہ افراد نے کئی مضامین پر کام کیا جن میں سیاسیات، معاشیات، سماجیات، تعلیم، فلسفہ، زبان وادب، قانون اور سائنس قابل ذکر ہیں۔ زیادہ تر مضامین سماجی علوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابو سلیمان، التغائی حامد اور عبد الرشید نے سیاسیات کو اسلامی تناظر میں پیش کرنے کی سعی کی۔ ابراہیم راغب، اوصاف احمد، الیاس بائینو اور نجات اللہ صدیقی نے سماجیات کو اسلامائز کرنے کی بحث کی۔ ڈاکٹر نقیب العطاس، ڈاکٹر راجی الفاروقی،، سید حسین نصر اور ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی نے تعلیم کو موضوع بنا کر اسلامائز کرنے کی کوشش کی۔ قانون کی تعلیم کی

اسلام کاری میں، سید حسین نصر اور ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی نے پانا بھرپور حصہ ڈالا۔ اس کے ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی نے تھیالوجی یعنی مذہبیات کو بھی اسلامی تناظر میں ڈھالنے کا بیڑا اٹھایا۔ فلسفہ اور سائنسی علوم کو اسلامی رنگ میں پیش کرنے کا سہرا اسید نقیب العطاس اور سید حسین نصر کے سر بندھتا ہے۔

علوم کی اسلام کاری کی یہ تحریک جس میں مسلمان مفکرین نے اپنا کردار ادا کیا، مختلف مراحل سے گزرنے کے باوجود ابھی بھی ابتدائی مراحل میں ہے اور اس کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے اور علوم کی اسلامائزیشن کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی دنیا کی تعلیمی تشکیلِ نو کے ایجنڈے میں اس امر کو ایک خاص مقام دیا جائے۔ اس میدان میں جن مفکرین نے بھی اپنی خدمات پیش کی ہیں اور جنھوں نے بھی اپنی آراء پیش کی ہیں ان میں بلاشبہ اختلاف ہے لیکن اس اختلاف کی حیثیت ثانوی ہے، اصل کام علوم کی اسلامی تشکیل ہے جسے بہر حال جاری رہنا چاہیے۔

حواشی و حوالہ جات

[1] اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد: 21، ص 741

[2] Fazlur Rahman, "Palestine and the Young Isma'il Al-Faruqi", Islamic Horizons (August/September 1986), pp. 39-44

[3] خورشید احمد، اسماعیل راجی الفاروقی، (ترجمہ: عارف الحق)، ص 9-10، غیر مطبوعہ؛ Esposito, Makers of Contemporary Islam, pp. 32-34

[4] Shafiq, Growth of Islamic Thought in North America: Focus on Isma'il Raji al-Faruqi, pp. 117-124.

[5] Imtiyaz Yousaf, Islam and Knowledge: Al Faruqi's Concept of Religion in Islamic Thought, pg. 2, I.B Tauris New Yark, 2012 A.D.

[6] اسماعیل راجی الفاروقی کے نظریۂ توحید کے تنقیدی مطالعہ کے لیے دیکھیے: Esposito, Makers of Contemporary Islam, p. 29.

[7] الفاروقی کی تحریروں میں اقبال کے حوالے ملتے ہیں، دیکھیے:

Isma'il Raji al-Faruqi, The Hijrah: The Necessity of Its Iqamat OR Vergegenw' Artigung (Islamabad: National Hijra Council, 1985), p. 17.

[8] علوم کی اسلامی تشکیل کے بارے میں اسماعیل راجی الفاروقی کے نظریات نیز عملی خدمات کے لیے ملاحظہ ہو:

Isma'il Raji al-Faruqi, "Islamization of Knowledge", in Knowledge for What? , Proceedings and Papers of the Seminar on Islamization of Knowledge (Islamabad: National Hijra Council, 1986), pp. 1-50

[9] تفصیل کے لیے دیکھیے:

John L. Esposito & John O. Voll, Makers of Contemporary Islam (Oxford / New York: Oxford University Press, 2001), p. 32.

[10] اسماعیل راجی الفاروقی Islamization of Knowledge: General Priciples and Worl Plan،(اردو ترجمہ: سید عاصم علی)،(علی گڑھ سینٹر فار اسٹڈیز ان سائنس)، ص 30۔

[11] Islamization of Knowledge: General Priciples and Worl Plan، ص 31

[12] ایضاً ۔

[13] ایضاً ۔

[14] ایضاً ۔

[15] ایضاً ۔

[16] ایضاً ۔

[17] ایضاً ۔

[18] ایضاً ۔

[19] Syed Muhammad Naquib Al Attas, Aims and Objectives of Islamic Education, pg. 31, King Abdul Aziz University, Jedda, 1979 A.D.

[20] Syed Muhammad Naquib Al Attas. Islam and Secularism, pg. 15-18, Kuala Lampor, ABIMP, 1975 A.D.

[21] Sheikh Ahmed Kutty. Remembering Dr. Jabar Alwani, www.islamism.ca, visited at 1725 hours, on 25-01-2019.

[22] www.zainabalwani.com, visited at 1839 hours on 25-01-2019.

[23] ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی. **عالمِ اسلام کا ایک ممتاز فقیہ و مفکر ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی**،ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی نمبر، سہ ماہی مطالعات، جنوری تا مارچ 2017ء، ص 39۔

[24] ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی. **دینی تعلیم اصلاح و جمود کی کشمکش کا مطالعہ** (اردو ترجمہ: عبید اللہ فہد)،(نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو سٹڈز، 2012ء)، ص 55۔

[25] سید متین احمد شاہ. ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی، **شخصیت اور فکر**، ماہنامہ الشریعہ، اپریل 2011ء، ص 27۔

[26] ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی. فکرِ اسلامی کی اصلاح: امکانات اور دشواریاں، ص 29، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، 1994ء

[27] ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی. جدید فکری بحران: **نشان دہی اور حل**،(ترجمہ: عبد الحفیظ رحمانی)،(نئی دہلی: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز)، ص 5۔

[28] ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی. **مقدمۃ فی اسلامیۃ المعرفۃ**، ،(بیروت: دار الہادی، مطابع 2001ء)، ص 186۔